بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

یومِ آزادی: پس منظر اور پیش منظر

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

اگست کا مہینہ ہر سال پاکستان اور بیرونِ پاکستان پاکستانیوں میں تصورِ پاکستان سے وابستگی کے احساس کو تازہ اور قیام پاکستان پر اللہ تعالیٰ کے شکر اور احسان مندی کے جذبات میں اضافہ کرتا ہے۔ ہر شخص گلی کوچوں میں، شہروں میں، گاؤں میں، موٹر سائیکل، سائیکل، ریڑھی، ویگن، پبلک اور پرائیوٹ ٹرانسپورٹ، ہر پاکستانی سبز ہلالی پرچم لہرانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اسکولوں میں بچے پاکستان کے پرچم کے رنگ کے لباس زیب تن کر کے ملی ترانے اور تقریری مقابلوں میں حصّہ لیتے ہیں اور تقریباً پورا مہینہ جشنِ آزادی کا منظر پیش کرتا ہے جس سے وطن عزیز کے ساتھ نوجوانوں کی محبت کا اظہار ثابت ہوتا ہے، لیکن قوم کیا اس محبت کے محرکات، تقاضوں اور مطالبات کا شعور بھی رکھتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا مناسب جواب تلاش کیے بغیر ہم ملک وقوم کے مستقبل کی تعمیر وتشکیل کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

تاریخ کے اوراق کو پلٹا جائے تو دنیا کے نقشے میں شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے صدیوں کی جنگِ آزادی کو محض ایک عشرے سے بھی کم یعنی سات سال کی قلیل مدت میں اپنی منزل اور اپنے فوری ہدف کے حصول کو ممکن بنایا ہو۔ الجزائر ہو یا یورپ میں برپا ہونے والی آزادی کی تحریکات، مثلاً: شمالی آئرش ریپبلک کی آزادی کی تحریک، یہ سب دو صدیوں پر محیط نظر آتی ہیں۔ برعظیم میں مسلمانوں میں انگریز کی محکومیت سے آزادی کی تحریک مختلف مراحل سے گزرتی رہی۔ آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قراردادِ پاکستان مسلم لیگ کے کنونشن میں منظور کی گئی۔ اس میں باضابطہ طور پر برعظیم کے مغربی اور مشرقی صوبوں پر علاحدہ قومیت کی بنیاد پر دو ایسے خطوں کی خودمختاری کا

مطالبہ کیا گیا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی تھی۔ اس تاریخی موڑ پر یہ سوال کرنا فطری ہے کہ کیا حصولِ پاکستان محض ایک قومی ریاست کے وجود کا مطالبہ تھا یا دو سو سال کی غلامی کے بعد مسلمان بطور ایک امت اس خطّے میں اسلامی تصورِ حیات، اسلامی معیشت، اسلامی ابلاغ عامہ، اسلامی معاشرے اور اسلامی ثقافت کے احیا کے لیے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے؟

تحریکِ پاکستان: تاریخی پس منظر

تاریخ گواہ ہے کہ برعظیم کے مسلمان ایک طویل عرصے انگریز کے عدم مساوات کے رویے کا شکار رہے۔ مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی، ملازمتوں میں واضح جانب دارانہ رویہ اور تعلیم اور تجارت میں کھلے کھلے تعصّبات اور تفریق کو دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اپنے اسلامی تشخص اور اپنی ثقافت وتہذیب کے تحفظ و بقا کے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کریں۔

ہندو اکثریت انگریز کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کر کے اپنی عددی فوقیت کی بنیاد پر مسلمانوں پر حاکمیت کے منصوبے پر مصروفِ عمل تھی لیکن اپنی فطرت سے مجبور ہوکر دکھاوے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگا کر اور مغرب سے متاثر مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے بے تاب اور سرگرم تھی۔

ان حالات میں ۱۹۰۰-۱۹۰۱ء کے دوران نواب محسن الملک نے بزم دفاع اردو کے تناظر میں ہندو کانگریس سے الگ مسلمانوں کی نمایندہ جماعت کے قیام پر قوم کو متوجہ کیا۔ اور اسی تصور اور فکر کی بنیاد پر ۱۹۰۵ء میں نواب سلیم اللہ کے مکان پر مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ پھر اکتوبر ۱۹۰۶ء میں آغا خان کی سربراہی میں ۳۵؍ افراد پر مشتمل مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے لارڈ مینٹو سے شملہ میں ملاقات کی اور انھیں اپنے مطالبات و خدشات سے آگاہ کیا اور جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ یہ گویا باضابطہ طور پر دوقومی نظریے کا اعلان تھا کہ مسلمان اپنی ثقافت، لباس، غذا، زبان، تصورِ خدا، طرزِ معاشرت، معیشت، غرض ہر شعبۂ حیات میں اختلاف کے سبب صدیوں سے ایک ملک میں غیرمسلموں کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود ہر تعریف کی

رو سے ایک الگ قوم ہیں، جن کا دین بنیادی تصورات و ترجیحات ہندوؤں کے تصورِ حیات کی ضد اور اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں، اور اب گویا وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے وجود اور تشخص کے لیے ایک آزاد خطّے کا مطالبہ کریں۔ مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت، ان کی جدوجہد اور اللہ ربّ العزت کے فضل و کرم سے ایک مختصر عرصے میں قیامِ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ''ایمان، اتحاد اور تنظیم'' کے بغیر پاکستان کا حصول ناممکن تھا۔ جنگ آزادی کے عمل کی بنیاد ایمان پر تھی۔ وہی ایمان اتحاد کی بنیاد تھا جس نے عصبیتوں اور قومیتوں کی جگہ لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے دلوں کو جوڑ دیا، اور یہ ایمان ہی تھا جس نے منتشر افراد کے اس گروہ کو جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا ایک تنظیم میں یکجا ہونے کی توفیق دی اور یہ ثابت کر دیا کہ ایمان کا لنگر مضبوط ہوگا، اور بقیہ دو اُصول اتحاد اور تنظیم بھی مستحکم ہوں گے تو پھر دنیا کی کوئی قوت اسے زیر نہیں کر سکتی۔

اس سے قطع نظر کہ مصلحت یا سیاسی حکمت عملی کی بنا پر مسلم لیگ میں ایسے افراد بھی شامل ہو گئے تھے جو انگریز سے ٹکراؤ قطعاً نہیں چاہتے تھے۔ اور پھر وہ انگریز کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ کانگریس کی طرح وہ بھی برطانوی تاج کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہیں، اور مسلمان صرف چند حقوق کے حصول کے لیے دستوری جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود جس چیز نے پورے خطے کے مسلمانوں کو یکجا کرنے میں اکسیر کا کام کیا وہ صرف لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ تھے، جن کا واضح مفہوم اللہ کی حاکمیت کا اللہ کی زمین پر قیام تھا۔

۱۳/اگست ۱۹۱۹ء کو جلیانہ والا باغ، امرتسر کے سانحے میں ۱۵۱۶/افراد کو بہیمانہ طور پر گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ واقعہ ملک گیر پیمانے پر عوام الناس کو جگانے کا ایک بڑا سبب بنا۔

مسلم لیگ کے مصلحت پسند مسلمانوں کو بھی یہ یقین ہو گیا کہ ان کی جان، مال، دین اور مستقبل انگریز کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس دوران اتحادی افواج کا ترکی کے ساتھ رویہ مسلمانوں کے جذبات کو مزید مشتعل کرنے کا سبب بنا اور انگریز کی مسلم دشمنی کی اس واضح مثال کے بعد ردعمل کے طور پر تحریکِ خلافت شروع ہوگئی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کا کردار نمایاں رہا۔

اس دوران ہندو راہ نماؤں نے جو اپنی عددی اکثریت پر پہلے ہی نازاں تھے، شدّھی کی

تحریک کا آغاز کر دیا اور مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کی مہم شروع کی۔ ان تمام واقعات نے مسلم قیادت کو اس بات پر یکسو اور متفق کر دیا کہ حقیقت میں مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ ان کا دین، زبان، ثقافت، تاریخ، تصور کائنات، تصور انسان، تصور آخرت ہر چیز ہندوؤں سے مختلف ہے۔ اس لیے ایسے حالات میں جب ہندو اکثریت زبردستی مسلمانوں کو ہندو بنانے اور اپنی محکوم بنانے پر تلی ہوئی ہے، آزادی کے لیے متحدہ طور پر جدوجہد بے معنی ہے۔ چنانچہ انھیں اپنی آزادی کے حصول کے لیے ایک الگ قوم کی حیثیت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر جدوجہد کرنا ہوگی۔

فروری ۱۹۲۸ء میں جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو کی سربراہی میں جو رپورٹ پیش کی گئی، اس میں لکھنو کے معاہدہ ۱۹۱۶ء کو مکمل طور پر نظرانداز کر کے خود کانگریس نے باضابطہ یہ اعلان کر دیا کہ وہ صرف ہندوؤں کی آزادی کے لیے متحرک ہے اور وہ کسی مسلم مفاد کا تحفظ نہیں کرسکتی۔ مولانا محمد علی جوہرؒ بھی اس واقعے کے بعد کانگریس سے علاحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔

دینی و ثقافتی تشخص کا تحفظ اور اقبال

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علّامہ اقبالؒ نے حالات کے تجزیہ کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ اپنے دینی اور ثقافتی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے بطور نقطۂ آغاز وہ علاقے جہاں مسلم اکثریت ہے، ایک یا زائد خودمختار اکائیوں کی شکل میں یکجا ہوں، مثلاً: پنجاب، شمالی مغربی سرحد، سندھ اور بلوچستان کو بطور ایک اکائی یکجا کر دیا جائے۔ اس خطاب میں انھوں نے نظریاتی بنیاد کو بھی واضح کر دیا کہ توحید اور اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک مسلم ریاست کا قیام ہی اہل خطہ کے لیے راہ نجات فراہم کرسکتا ہے۔ علامہ کے الفاظ یہ تھے:

> یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے ___ اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے، جس کا نظم وانضباط کسی نظامِ قانون کے تحت عمل میں آتا ہو، اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم عمل ہو___ اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا، جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات وعواطف سے معمور ہوئے، جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے، اور جن سے متفرق ومنتشر افراد بتدریج

متحد ہوکر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہے، جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندستان میں بھی اسلامی جماعت کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے۔ اس لیے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے.... لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندستان میں ایک اسلامی ہند قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے.... ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

میری ذاتی طور پر خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر خودمختاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم مسلم ریاست قائم کرنا پڑے گی۔

۱۶/ اگست ۱۹۳۲ء کو کیے جانے والے کمیونل ایوارڈ (Communal Award) نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر کے مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے پر سرکاری مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ برطانوی سامراج اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا کہ استعماری چراغ کی لَو بجھنے والی ہے، اس لیے اس نے اپنی روایتی مسلم دشمنی کی بنا پر ایسے فیصلے کیے جن کا نقصان مسلمانوں کو ہوا اور جنھیں مسلمان مجبوراً ماننے پر آمادہ ہوئے، مثلاً ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں فیڈرل، پروینشل اور concurrent کی تقسیم جس میں فیڈرل فہرست اور صوبائی فہرست میں بعض اختیارات دینے کے باوجود اسے ایک ملغوبہ بنایا گیا۔ اس قانون کو قائداعظم نے ناقابلِ قبول قرار دیا لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں مسلم لیگ کو ٹکراؤ کی جگہ مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی روشنی میں ہونے والے انتخابات کے بعد ۱۹۳۷ء-۱۹۳۹ء میں کانگریس کی حکومت نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ابھی مکمل آزادی نہیں ملی تھی لیکن کانگریس نے اپنے ماتحت مقامات پر نظامِ تعلیم اور نصابی کتب کو وِدیا مندر منصوبہ کے تحت تبدیل

کر دیا اور طلبہ کے لیے ہر صبح بندے ماترم کا ترانہ گانا لازمی قرار دیا۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے پٹنہ سیشن میں اس ترانے کو شدت کے ساتھ ردّ کیا گیا اور اسے بت پرستی اور مسلم دشمنی کی واضح مثال قرار دیا گیا۔

اس تناظر میں علامہ اقبال کا ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کا خط اہم راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ وہ قائداعظم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوسو سالہ زوال اور ہندو کی مہاجن کی حیثیت سے مسلمانوں کے معاشی استحصال کے بعد اب نجات کی راہ کیا ہوگی؟ پھر خود جواب دیتے ہیں:

''روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دوسو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جارہی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو ساہوکار و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیرملکی حکومت بھی برابر کی ذمہ دار ہے اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کر کے رہے گا۔

''جواہر لال نہرو کی منکر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جاسکتی ہے؟ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوششیں کرتی ہے؟ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق رہیں گے۔

''خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور فقہ اسلامی کا مطالعہ مقتضیاتِ حاضرہ کے پیش نظر دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کرسکتا ہے۔ شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریقے پر سمجھا اور نافذ کیا جائے، تو ہر شخص کو کم از کم معاش کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ ناممکن ہے جب تک اس ملک میں ایک یا ایک سے زائد آزاد ریاستوں کا وجود نہ ہو۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں اور اگر ہندستان میں اس طریق کار پر عمل درآمد اور اس مقصد کا

حصول ناممکن ہے، تو پھر صرف ایک ہی راہ رہ جاتی ہے اور وہ خانہ جنگی ہے۔ جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی برسوں سے شروع ہے۔

''لیکن جیسا کہ اُوپر ذکر کر چکا ہوں اسلامی ہندستان میں ان مسائل کا حل بہ آسانی رائج کرنے کے لیے ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد آزاد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لعل کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے''۔

مسلم لیگ کے ۲۵ ویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں ۱۵-۱۸/اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اسی بات پر غور کیا گیا اور قائداعظم نے طے کیا کہ مسلم لیگ اب مکمل آزادی یا ایک فیڈریشن یا آزاد جمہوری ریاستوں کے قیام کی جدوجہد کرے گی تاکہ مسلمانوں کا مفاد محفوظ ہو سکے اور اقلیتوں کو بھی تحفظ ملے۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا کرنا لیگ کا مشن قرار پایا۔ اس جدوجہد کا منطقی نتیجہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منظور ہونے والی قرارداد میں ان الفاظ میں ظاہر ہوا:

> آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس نہایت غور وخوض کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے لیے صرف ایسے آئین کو قابلِ عمل اور قابلِ قبول قرار دیتا ہے، جو جغرافیائی اعتبار سے باہم متصل خطّوں کی صورت میں حد بندی کا عامل ہو اور بوقتِ ضرورت ان میں اس طرح ردو بدل ممکن ہو کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت بہ اعتبار تعداد ہو، جیسا کہ ہندستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے میں، انھیں آزاد ریاستوں کی صورت میں یکجا کر دیا جائے اور ان میں شامل ہونے والی وحدتیں خودمختار اور حاکمیت کی حامل ہوں۔

یہ وہ تاریخی موقع تھا جب مسلم لیگ نے یکسو ہو کر منزل کے حصول کے لیے ساری قوت صرف کرنا شروع کی۔ قائداعظم کے فولادی اعصاب نے ہر لحہ بدلتے حالات کی صورت حال میں اللہ پر اعتماد کے ساتھ مستقل مزاجی سے جنگ آزادی کی کامیاب قیادت کی۔ اس جدوجہد کا مقصد جیسا کہ علامہ اقبال کے خط بنام قائد سے واضح ہوتا ہے، نئے خطۂ پاک میں اسلامی شریعت کا نفاذ تھا۔ یہ ایک عجیب سانحہ ہے کہ علامہ اقبال اور قائد کے واضح تصور پاکستان کے باوجود پاکستان کے نام نہاد روشن خیال اور اباحیّت پسند دانشوروں نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد تصور پاکستان کے

حوالے سے ہندو کانگریس کے سیکولر ریاست کے تصور کو قائد کے تصور کے طور پر تکرار کے ساتھ پیش کیا اور دو قومی نظریہ کی جگہ سیکولر ریاست کے تصور کو عام کرنے میں اپنی تمام ذہانت استعمال کرتے ہوئے ابہام در ابہام پیدا کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ صحافت، نوکر شاہی اور دیگر ملکی اداروں میں جو افراد ذمہ دار بنے، ان میں سے کسی کو علامہ اور قائد کے تصور پاکستان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے انھیں پہاڑ کھودنے کے بعد لے دے کر ایک تقریر ایسی ملی جس کو اپنی فکر کے مطابق معنی پہنا کر اس کی جو تعبیر وہ کرنا چاہتے تھے، اس تعبیر کو قائد سے منسوب کر کے اس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ لوگ اسے سچ مان لیں لیکن حق و باطل کی اس کش مکش میں حق ہی کو غالب آنا تھا۔ اس تناظر میں علامہ اقبال اور قائداعظم کا تصور پاکستان کیا تھا؟ اسے انھی کے الفاظ میں جان کر ایک قاری صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔

قائداعظم کا وژن

یکم فروری ۱۹۴۳ء کو قیام پاکستان سے بہت پہلے ہوسٹل پارلیمنٹ اسماعیل یوسف کالج، بمبئی میں خطاب کرتے قائداعظم فرماتے ہیں:

> پاکستان میں ریاست اسلامی اصولوں کے مطابق چلائی جائے گی، اس کی ثقافت، سیاسی اور معاشی تشکیل اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگی۔ غیر مسلم اس امر سے خائف نہ ہوں کیوں کہ ان کے ساتھ مکمل عادلانہ رویہ رکھا جائے گا۔ ان کے ثقافتی، مذہبی، سیاسی، معاشی حقوق کا مکمل تحفظ ہوگا۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انھیں موجودہ نام نہاد جمہوری پارلیمنٹری طرز حکومت سے زیادہ تحفظات حاصل ہوں گے۔

لاہور میں ہونے والی یونی ورسٹی ریلی سے حصولِ آزادی کے بعد خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ہم نے اپنی منزل مقصود 'آزادی' پالی ہے اور ایک آزاد خودمختار اور دنیا کی پانچویں بڑی مملکت قائم ہو چکی ہے۔ اس برعظیم میں رونما ہونے والے حالیہ اندوہناک واقعات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی قوم ابتلا اور ایثار کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتی.... کچھ لوگوں کی غداری اور سازشوں سے اس برعظیم میں بدنظمی اور افراتفری کی

قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ سے لاکھوں اموات واقع ہوئیں۔ بہت وسیع پیمانے پر املاک کی تباہی اور بربادی ہوئی اور لاکھوں انسانوں کو اپنے گھر بار اور اپنی محبوب اشیا سے جدا کر کے اذیت اور مصائب میں مبتلا کر دیا گیا۔ ہم ایک نہایت گہری اور خوب سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے جس کا ارتکاب کرتے ہوئے دیانت داری، شجاعت اور وقار کے بنیادی اصولوں کا بھی مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہم اس تائید غیبی کے لیے سراپا شکر گزار ہیں کہ اس نے طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بہت حوصلہ اور ایمان کی قوت عطا کی۔ اگر ہم قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرتے رہے تو حتمی فتح، میں پھر کہتا ہوں، ہماری ہوگی۔ کام کی زیادتی سے، میں کہتا ہوں، گھبرایئے نہیں! نئی اقوام کی تاریخ میں کئی مثالیں (ملتی ہیں) جنھوں نے محض عزم اور کردار کی قوت کے بل پر اپنی تعمیر کی۔ آپ کی تخلیق ایک جوہرِ آب دار سے ہوئی ہے اور آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔ اوروں کی طرح اور خود اپنے آبا و اجداد کی طرح آپ بھی کیوں کامیاب نہیں ہوں گے؟ آپ کو صرف اپنے اندر مجاہدانہ جذبہ کو پروان چڑھانا ہوگا۔ آپ ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ قابل، صلاحیت کے حامل کرداروں اور بلند حوصلہ اشخاص سے بھری پڑی ہے۔ اپنی روایات پر قائم رہیے اور اس میں عظمت کے ایک اور باب کا اضافہ کر دیجیے۔

اب میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ ہر شخص تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ یہ عہد کرے کہ وہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے اور اسے دنیا کی صف میں شامل کرنے کے لیے بوقت ضرورت اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہوگا، جن کا نصب العین اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی امن ہوتا ہے۔

اسی بات کو قائداعظم محمد علی جناح نے فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام ریڈیائی پیغام میں کہا اور یاد رہے کہ یہ بیان بھی اس نام نہاد ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کے بعد کا ہے جسے جان بوجھ کر بار بار اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا ۱۱/اگست کی تقریر ہی ان کی وصیت تھی۔ قائداعظم امریکی عوام سے ریڈیو پر خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میرے لیے یہ امر انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ میں اہلیان ریاست ہائے متحدہ امریکا سے پاکستان، اس کی حکومت، اس کے افراد اور اس کے وسائل کے بارے میں اس نشریے کے ذریعے گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ مملکت جو کسی حد تک برعظیم کے ۱۰ کروڑ مسلمانوں کے حسین خواب کی تعبیر ہے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آئی۔ پاکستان سب سے بڑی اسلامی مملکت (Premier Islamic State) اور دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔

مجلس دستور ساز پاکستان کو ابھی پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا علم تو نہیں کہ دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی، لیکن مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا جس میں اسلام کے لازمی اصول شامل ہوں گے۔ آج بھی ان کا اطلاق عملی زندگی میں ایسے ہی ہوسکتا ہے جیسا کہ تیرہ سو برس قبل ہوسکتا تھا۔ اسلام نے ہر شخص کے ساتھ عدل اور انصاف کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شان دار روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کے آیندہ دستور کے مرتبین کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے باخبر ہیں۔ بہرنوع پاکستان ایسی تھیاکریسی نہیں ہوگا جہاں پادری فرماں رواں ہوں۔ غیرمسلم ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں، لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ انھیں وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی جو کسی اور شہری کو حاصل ہوسکتی ہیں اور وہ اُمورِ پاکستان میں اپنا جائز کردار ادا کرسکیں گے۔

قائداعظم اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات اور جدید دور میں قابل عمل نظام سمجھتے تھے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب میں فرماتے ہیں:

وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ لوگوں کا ایک طبقہ جو دانستہ طور پر شرارت کرنا چاہتا ہے، یہ پراپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کے دستور کی اساس شریعت پر استوار نہیں کی جائے گی.... آج بھی اسلامی اصولوں کا زندگی پر اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح تیرہ سو برس پیشتر ہوتا تھا.... جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بلاشبہہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس بات کو بالکل نہیں سراہتے۔

اسلام نہ صرف رسم و رواج، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ ہے، بلکہ اسلام

ہر مسلمان کے لیے ایک ضابطہ بھی ہے جو اس کی حیات اور اس کے رویے بلکہ اس کی سیاست و اقتصادیات وغیرہ پر محیط ہے۔ یہ وقار، دیانت، انصاف اور سب کے لیے عدل کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔

قائد کی ۱۹۴۳ء یعنی قیام پاکستان سے قبل اور ۱۹۴۸ء میں اس تقریر کے بعد جس میں انھوں نے وہ بات نہیں کہی جو ان کے شارح اپنی تعبیرات میں بیان کرتے ہیں، ان تمام تقاریر کو، جو بے ساختہ نہیں بلکہ تحریری شکل میں لکھنے کے بعد کی گئی تھیں، سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ان کے تسلسل، فکر اور موقف کی یگانگت اور یکسوئی میں ذرہ برابر فرق نظر نہیں آتا۔ جس طرح ۱۹۴۳ء میں وہ پاکستان کو بطور اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے بالکل اسی طرح ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار سے خطاب، ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار سے خطاب، فروری ۱۹۴۸ء کو امریکی عوام سے خطاب، ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو اِک اِک ریجمنٹ کراچی سے خطاب، یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بنک سے خطاب میں وہ ریاست کے اسلامی خدوخال کو اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام پر مبنی قرار دیتے ہیں۔

قائداعظم کے تصور پاکستان کے تقاضے

قائد کے ارشادات کی روشنی میں خود قائد کی حیات اور سربراہی میں دستور ساز اسمبلی میں ایک شعبہ مولانا سیّد سلمان ندوی کی صدارت میں قائم کر دیا گیا تھا جو اسلامی اصولوں کی روشنی میں دستور کے حوالے سے اسمبلی کی راہ نمائی کر کے دستوری سفارشات مرتب کرے۔ اسی طرح لاہور میں علامہ محمد اسد کی سربراہی میں ایک ادارہ پاکستان کی تعمیرِ نو کے نام سے قائم کیا گیا اور قائد کی حیات میں انھیں یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ پاکستان کے لیے دستور کے خدوخال پر دستاویز تیار کریں۔ یہ دستوری خاکہ جو علامہ اسد نے تحریر کیا، آج بھی ان کے اعزاز میں انگریزی میں طبع شدہ کتاب: Muhammad Asad (Leopold Weiss): Europe's gift to Islam (دو جلدیں) میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب انگریز کے اداروں میں تربیت پانے والے سرکاری اہل کار، عدلیہ میں انگریز کے ذہنی غلام نمایندے اور خود سیاسی محاذ پر پاکستان کے تصور کے مخالف افراد، مثلاً باچا خان و دیگر کے لیے یہ امر ناقابلِ ہضم تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست بن جائے، چنانچہ جسٹس منیر ہوں یا بیوروکریسی کے افراد جن میں ۱۹۶۴ء تک ۶۰ سے اُوپر افراد سیکرٹری کے عہدے

تک وہ تھے جن کی قومیت بھی برطانوی تھی۔ جن کی علمی تربیت برطانوی تصورِ ریاست پر ہوئی تھی۔ یہ افراد مغربی تصورات اور طرزِ زندگی پر یقین رکھتے تھے اور اسی وجہ سے دین اور ریاست کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے تھے۔

اس سب کے باوجود ۱۹۵۶ء کے دستوری مسودے میں قائد اور قوم کے خیالات کو نمایندگی دینے کی کوشش کی گئی، حتیٰ کہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی جن دفعات کو اسلامی کہا جاتا ہے، دستور کا دیباچہ (preamble) اس تصور کی وضاحت کرتا ہے۔ قرارداد مقاصد پیش کرتے وقت قائدِ ملت نے جو مفصل تقریر کی، اس کا ایک ایک لفظ قائداعظم کے تصور کی نمایندگی کرتا ہے۔ عوام نے بھی ہمیشہ تحریک پاکستان کے آغاز سے لے کر آج تک صرف اسلام کو ملک کی نظریاتی بنیاد قرار دیا۔ اب گذشتہ دو دہائیوں سے ملک جس تکلیف دہ صورتِ حال میں مبتلا ہے، اس سے نکلنے کی راہ اور حکمت عملی کیا ہو؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس پر ملک کے ہر صائب الرائے فرد کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ گو، ملک کی سیاسی قیادت آج بھی مفادات کی جنگ اور اخلاقی اقدار کی پامالی میں مصروفِ عمل ہے اور اس کے نتیجے میں ایک مزدور سے لے کر ایک دانش ور تک، ہر فرد ذہنی و فکری انتشار میں مبتلا ہے۔ قومی زندگی کے اس فیصلہ کن موڑ پر ریاست کے نظریاتی تحفظ کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ہم اس بھنور سے کیسے نکلیں اور قائد کے تصورِ پاکستان کے حصول کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں؟ اس حوالے سے چند بنیادی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

- **سیاسی انتہا پسندانہ لب و لہجے اور رویوں کی اصلاح**: ہندوؤں کی شاطرانہ سیاست، انگریز کی عیاری و مکاری، برعظیم کے علما کے ایک طبقے کی قائداعظم کے خلاف انتہا پسندانہ مہم اور 'کافر اعظم' جیسے بدترین لقب سے نوازے جانے کے باوجود قائداعظم نے صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور انتہائی متانت اور بردباری سے سیاسی مکالمے اور بات چیت کا عمل جاری رکھا۔ قائداعظم کا یہ طرزِ عمل پاکستان کے موجودہ سیاست دانوں کو دوبارہ یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ آج سیاست میں رائج زبان، لب و لہجے اور طرزِ عمل کو کسی طور پر درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دُکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمام سیاسی قائدین اور بڑی جماعتیں شاید حالات کے دباؤ اور نفسیاتی تناؤ کے باعث مہذب زبان و بیان کو مکمل طور پر ترک کر کے محض

دھونس، دھمکی اور اشتعال انگیز لب و لہجے میں ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی عادی ہوگئی ہیں۔ اس کشیدہ سیاسی منظرنامے کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کے کارکنان بالخصوص نوجوان بھی سوشل میڈیا کے محاذ پر اشتعال انگیز لب و لہجے میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ اس کشیدہ فضا کو دُور کرنے کے لیے مناسب لائحہ عمل ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ کسی تبادلۂ خیال کے آغاز سے قبل یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ مسائل کے حل کے لیے باہمی مشاورت و گفتگو کا لہجہ باہمی احترام اور مفاہمت کا ہو۔ ہمارا دین ہمیں قولِ حسن کا پابند کرتا ہے اور اختلافِ رائے کے حق کا احترام کرتے ہوئے اور آداب اختلاف کی پابندی پر زور دیتا ہے۔ اس اصول کو کسی قیمت پر پامال نہیں ہونا چاہیے۔ آج باہمی احترام اور ذاتیات سے بلند ہو کر اصولوں پر تبادلۂ خیال کی روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ انانیت، عدم برداشت، ٹکراؤ سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ مداہنت کے بغیر مکالمہ مسائل کے حل کی طرف لے جانے کا زیادہ بہتر ذریعہ ہے۔

● **پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کا تحفظ:** قائداعظم نے اپنے متعدد خطابات میں خصوصاً اِک اِک رجمنٹ ملیر کراچی، پنجاب یونی ورسٹی کی ریلی اور پشاور میں مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام اپنے تحریری پیغام میں قوم کے نوجوانوں، مسلح افواج کے افسران اور عام طلبہ سے خطاب میں پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے تحفظ اور ان کے لیے جان، مال، وقت، صلاحیت، غرض ہر شے کی قربانی کا مطالبہ کرتے ہوئے پاکستان کو اسلام کا قلعہ قرار دیا۔ چنانچہ اب ملک گیر پیمانے پر علمی اور عملی میدانوں میں عصبیت، مسلکی منافرت، بدامنی اور لاقانونیت کے خاتمے اور ملک میں اسلامی عادلانہ نظام کے قیام کے لیے منظم جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

● **قائد کے فرمان کی روشنی میں سودی نظام سے نجات:** قائد نے اسٹیٹ بنک کے تحقیقی ادارے کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں، جو ان کے انتقال سے قبل ان کا آخری خطاب تھا، اس تحقیقی ادارے کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ مغربی سرمایہ دارانہ معیشت کی جگہ (جو ان کی نگاہ میں اپنی تباہی کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی) اسلامی معاشرتی عدل پر مبنی ایک معاشی حکمت عملی تیار کرے۔ افسوس کہ پاکستان قائد کی خواہش کے خلاف سرمایہ دارانہ معیشت میں دھنستا چلا گیا ہے۔ اسے اس دلدل سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ معاشیات کے شعبے اور تحقیقی اداروں کا کام ہے

کہ وہ معاشی مسائل کا اسلامی حل پیش کریں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے متبادل اسلامی معیشت اور بنکاری کے عملی تجربات کی روشنی میں ایک مشترکہ حکمت عملی وضع کریں، تاکہ کم سے کم وقت میں ملک اور دنیا کو سود کی لعنت سے نجات دلائی جاسکے۔

• **دستور کی روح اور الفاظ کی پیروی:** قائد کی خواہش کے مطابق دستورِ پاکستان کی دفعات کی پیروی کرتے ہوئے ملک میں عدلیہ، پارلیمنٹ اور انتظامیہ تینوں کو دستور کے احترام اور پیروی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہر ادارہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر ہی ملک کی خدمت کرسکتا ہے۔ جو ادارے کسی بیرونی حملے سے تحفظ کے لیے بنائے گئے ہیں ان کا کام بیرونی دشمنوں سے تحفظ ہی ہے، اور جو ادارے عدل و انصاف کے لیے بنے ہیں انھیں بلا کسی خوف وخطر اپنا فرض منصبی ادا کرنا چاہیے۔ انھیں کسی سیاسی جوڑ توڑ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ یہی بات قائد نے سول اور فوجی افسران سے خطابات میں صاف الفاظ میں کہی ہے۔

• **نظام تعلیم کی درستی:** قائد، ملک میں اعلیٰ اقدار پر مبنی نظام تعلیم و ابلاغ عامہ کا فروغ چاہتے تھے۔ مقتدر اداروں اور عوام دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک سے فحاشی، عریانی، لادینیت، انانیت پسندی، انفرادیت اور مفاد پرستی کی جگہ اسلام کے عالم گیر اُصولوں کو اداراتی بنیادوں پر رواج دیں تاکہ آیندہ نسلیں قائد اور اقبال کے خواب کی تعبیر پیش کرسکیں۔ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے ایسے ماہرینِ فن تو پیدا ہو رہے ہیں جو ملک میں اور ملک سے باہر جا کر اپنے پیٹ کی ضروریات پوری کرتے ہیں، لیکن ایسے انسان، جو حق و باطل میں امتیاز کرنے کے ساتھ حق، سچائی، عدل، حقوق اللہ کی ادائیگی اور اللہ کے بندوں کے حقوق کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، پیدا نہیں ہو رہے۔ اسلامی اخلاقی اقدار کو جب تک نصابِ تعلیم، طریقِ تدریس اور شخصیت کی نشوونما کی بنیاد نہیں بنایا جائے گا، اس وقت تک ہم ایسا معاشرہ تعمیر نہیں کرسکتے جو عدل، احترامِ عقل و نسل اور حُرمتِ مال اور دینی شعار کا احترام کرنا سکھائے۔

• **تعلیمی نصاب پر نظر ثانی:** نصابی کتب میں قائد کے تصورِ پاکستان پر مبنی تقریریں، قائد ملت کے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کرتے وقت تقریر، اور دیگر ایسی دستاویزات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے، جو قائد کے تصورِ پاکستان کی وضاحت کرتی ہیں۔ اسی طرح نئی نسل

کے لیے قائداعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے موضوع پر اردو اور انگریزی زبان میں کتب اور خوب صورت دیدہ زیب کتابچے و دیگر تعلیمی مصنوعات تیار کرنے کی ضرورت بھی ہے۔

• **علمی مواد کی فراہمی:** دینی مدارس اور جدید تعلیمی جامعات جہاں نظریۂ پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے افراد ہوں، وہاں لائبریریوں میں تحریک پاکستان، قائداعظم، علامہ اقبال کے افکار و نظریات پر مبنی کتب کے خصوصی گوشے بنائے جائیں اور تسلسل سے طلبہ و طالبات کو ان گوشوں سے متعارف کروایا جائے تاکہ نئی نسل کی ذہنی و فکری آبیاری ہو۔

• **جامعات اور تعلیمی اداروں میں آگاہی مہمات:** قائداعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے دیگر راہنماؤں کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے اور ان کی فکر سے نئی نسل کو روشناس کروانے کے لیے سرکاری اور غیرسرکاری اداروں کے تحت بین الاضلاعی، صوبائی اور ملک گیر پیمانے پر کالجوں، اسکولوں اور جامعات کے طلبہ و طالبات کے لیے مضامین نویسی اور تقریری مقابلوں کا انعقاد ہونا چاہیے۔

• **معمّر افراد کی گفتگو:** ابھی کچھ ایسے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے پاکستان کو وجود میں آتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان سے براہِ راست نوجوان نسل کی گفتگو ملک کے تحفظ اور مستقبل کی تعمیر کے حوالے سے بہت ضروری ہے۔

• **قائد کی مغربی فکر کی مذمت کی روشنی میں اسلامی خاندانی نظام کا تحفظ:** قائد نے مغربی فکر، نظام اور طرز زندگی کو انسانیت کے لیے زہرِ قاتل قرار دیا اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں نئی مملکت میں معاشرے کی تعمیر کا تصور پیش کیا۔ آج مغرب اور مغرب کے زیر اثر مسلم فرماں روا آنکھیں بند کر کے عالمی سطح پر انسانی حقوق کے نعرہ کے نام پر ہم جنس پرستی اور خواجہ سراؤں کے نام پر ہونے والی قوانین سازی کے ذریعے عریانی، فحاشی اور مہلک بیماریوں کی جڑ جنسی آزادی کو مسلم دنیا کے اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں بہ خوشی شامل کر رہے ہیں۔ اسلامی خاندانی نظام کے احیا اور خاندان کے ادارے کو تباہی سے بچانے کے لیے تعلیم، ابلاغ عامہ، قانون، سوشل میڈیا، غرض ہر ممکنہ ذریعے سے خاندان کی عظمت و احترام کو بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

• **قومی ایام کا اہتمام:** یوم آزادی اور یوم قرارداد پاکستان کے خصوصی اجتماعات کے

لیے تحقیقی مواد پر مبنی سرگرمیاں ہر ضلعے میں منعقد کی جائیں اور نوجوان مقررین کو بات کرنے کا موقع دیا جائے۔

ان چند عملی تجاویز پر عمل کرنے کے لیے کسی بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں صرف عقلی اور علمی سرمایہ کو استعمال کرتے ہوئے اور غیر سرکاری اداروں میں حکمت و تدبر کے ساتھ ان تجاویز پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم اپنے طرزِعمل میں سیاسی ہنگامہ خیزی اور سیاسی تبدیلی کے ذریعے ملک اور معاشرے میں اصلاح کی جگہ اسلامی تعمیرِ شخصیت اور کردار کی تبدیلی کو اوّلیت اور فوقیت دے۔تعمیرِ کردار اور اصلاحِ فکر کے بغیر کوئی سیاسی تحریک نہ آج تک کامیاب ہوئی ہے، نہ ہوسکتی ہے۔انسانیت کے محسن اور کامل ترین قائد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ اور عمل کی اصلاح کے بعد جو باکردار اصحاب پیدا کیے، وہی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور قانونی نظام کے معمار اور محافظ بنے۔جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کسی اصلاحی اور دعوتی تحریک کا کتنے فی صد مساعی کا حصّہ تطہیرِ افکار اور تعمیرِ شخصیت و کردار پر صرف ہو رہا ہے اور کتنے فی صد سرگرمی ہنگامی طور پر آگ بجھانے کے کام میں لگ رہی ہے۔

تحریک کو ایسے انسانی وسائل کی ضرورت ہے جو مثبت طور پر حکمت عملی پر پورا عبور رکھنے کے ساتھ فکری، جذباتی اور عملی طور پر اس سیرت و کردار کا نمونہ ہوں جو صداقت، امانت، شہادتِ حق، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری اور اسلام کے حقیقی تصور کی عملی مثال ہوں۔فکری و نظریاتی طور پر تربیت یافتہ بااخلاق کارکنان کے بغیر کوئی پائدار سیاسی ہدف حاصل نہیں ہوسکتا اور بنیادوں کے استحکام کے بغیر کوئی مضبوط عمارت نہ قائم ہوسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔پاکستان میں عدم استحکام کا سبب ان بنیادوں کو اہمیت نہ دینا ہے، جس کی طرف قائداعظم نے متوجہ کیا تھا۔ اگست کا مہینہ اس بابرکت رات یعنی لیلۃ القدر کی یاددہانی کراتا ہے جس میں ستائیسویں شب کو اللہ تعالیٰ نے معجزاتی طور پر لا الٰہ الا اللہ کی علَم بردار ایک قوم کو ایک ملک دیا تھا، تاکہ وہ اس ملک میں حاکمِ کائنات کی ہدایت و احکامات کے نفاذ کے لیے کمربستہ ہو۔ یہ یاددہانی ۷۶ سال کے بعد بھی ویسی ہی تابناک ہے جیسے روزِ اول تھی۔صرف آگے بڑھ کر اس کے لیے انسانی وسائل کو یکجا کرنے اور منظم جدوجہد کے ذریعے عقل، فہم و تدبر اور حکمت کی قوتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

فتنہ وفساد کے سدِّ باب کی تدبیر

دُنیا میں کم از کم ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بدکاروں کا ہاتھ پکڑنے والا، بدی کو روکنے والا، اور نیکوکاری کا حکم دینے والا ہو۔ اللہ کی طرف سے اس کی زمین پر گواہ ہو، لوگوں کی دیکھ بھال کرتا رہے، شرارت کے عناصر کو قابو میں رکھے، انصاف قائم کرے اور بدی کو کبھی سر نکالنے کا موقع نہ دے۔ اللہ کی مخلوق کو عام تباہی سے بچانے اور اس کی زمین کو شر و فساد اور ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے گروہ کا وجود نہایت ضروری ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۴) اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لیے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جدوجہد (جہاد) سے، اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ (قتال) کے ذریعے سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور ان کی جگہ عادلانہ و منصفانہ نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور خدا کے مقرر کیے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے۔ جو شخصی یا طبقاتی یا قومی اغراض کے بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے، جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو، اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں اور اپنی بڑائی کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی کے لیے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیں....

قرآن مجید وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لیے مسلمان پیدا کیے گئے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۱۰) تم ایک بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(خیرخواہ) (الجہاد فی الاسلام)

باکردار اور باصلاحیت قیادت کی فراہمی

ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کرلی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع [مرکز] بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اُسے حاصل ہوجائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اُس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہوکر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔

ایک ٹھوس، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلے کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا ورنہ تحریک کی تباہی ناگزیر ہے۔ اگر موجودہ حالات میں عوام کو اُکسا دیا جائے، جب کہ عوام کو سنبھال کر لے چلنے والے مقامی رہنما (Sub - leaders) موجود نہیں ہیں تو عوام بالکل بے راہ روی پر اُتر آئیں گے اور اپنے آپ کو نااہل لوگوں کے حوالے کردیں گے۔

عمومی تحریک (mass movement) کے آغاز سے پہلے چند تعمیری کام کرلینے ضروری ہیں: ایک یہ کہ ہم اپنے تعلیمی [وتربیتی] پروگرام کی بِنا ڈال دیں، کیونکہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے نصب العین [اسلامی نظامِ حکومت کا قیام] تک پہنچ جائیں۔ اس لیے ہمیں ابھی سے یہ فکر کرنی چاہیے کہ ہم اپنی جگہ اپنے سے بہتر کام کرنے کے لیے آیندہ نسل کو تیار کرنا شروع کردیں۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(رُوداد جماعت اسلامی، اوّل)

(عطیۂ اشتہار: صوفی بابا)